

غم اور خوف سے نجات

قرآنی تعلیمات کی روشنی میں ایک تجزیاتی مطالعہ

— ڈاکٹر احمد افضال —

انسانیت کے دکھوں سے متاثر ہونے کے لئے شاعر یا فلسفی ہونا ضروری نہیں۔ ہر شخص کبھی نہ کبھی ضرور سوچتا ہے کہ زندگی کا مقصد آخر ہے کیا؟ انسانوں کی عظیم اکثریت تکلیفوں، مایوسیوں اور ناکامیوں سے کیوں دوچار رہتی ہے؟ بیماری اور موت جیسی دہشت ناک چیزیں اتنی عالمگیر اور ہمہ گیر کیوں ہیں؟ کیا وجہ ہے کہ انسانی خوشیاں معدوم ہونے کی حد تک محدود ہیں اور رنج و آلام اس قدر زیادہ ہیں گویا یہی مقصود فطرت ہوں؟ ہمیں غم اور خوف دے کر فطرت حاصل کیا کرنا چاہتی ہے؟

اولاً تو غم اور خوف کی حقیقت سمجھنا چاہئے۔ غم کا مطلب ہے ماضی میں ہونے والے کسی نقصان پر افسردہ ہونا، اور خوف کہتے ہیں مستقبل میں کسی قسم کا نقصان پہنچنے کے اندیشے کو۔ ان دونوں حالتوں میں بنیادی تصور کسی محبوب چیز کے ضائع ہو جانے کا ہے۔ جب وہ شے چھن جاتی ہے تو ہم غمگین ہو جاتے ہیں اور جب اس کے چھن جانے کا صرف خطرہ ہوتا ہے تو ہم خوف زدہ رہتے ہیں۔

دراصل تمام لوگوں میں غم اور خوف کے مقابلے کی استعداد برابر نہیں ہوتی۔ ہم جانتے ہیں کہ جب اداسی برداشت سے باہر ہو جائے تو زندگی بے کار و بے مقصد محسوس ہونے لگتی ہے اور انسان گویا جیتے جی مر جاتا ہے۔

کوئی آکے شمع جلائے کیوں میں وہ بے کسی کا مزار ہوں

یا اگر ڈر اور تشویش برداشت سے باہر ہو جائے تو انسان کی نیندیں اڑ جاتی ہیں اور وہ خوف سے

مفلوج ہو کر رہ جاتا ہے۔

کہیں ایسا نہ ہو جائے، کہیں ایسا نہ ہو جائے

بعض افراد میں یہ ”ناقابل برداشت“ ہونے کا مقام یا ”THRESHOLD“ بہت دور جا کر آتا ہے، لیکن اکثر لوگوں میں فورا ہی آجاتا ہے۔ عام مشاہدہ بھی یہی ہے کہ ہمت و حوصلے والے افراد ہمت کم ہوتے ہیں جبکہ زیادہ تعداد ان لوگوں کی رہتی ہے جو مصائب کو دیکھ کر مایوس ہو جاتے ہیں اور آنے والی آفتوں سے لرزاں و ترساں رہتے ہیں۔ لیکن اس تلخ حقیقت کے باوجود انسان کی دل تمنا یہی ہے کہ کسی طرح فکر فردا اور غم دوش سے کھل چھٹکارا حاصل ہو جائے۔

سب سے اہم بات یہ ہے کہ گزرے ہوئے سانحوں کو یاد رکھنے ہی سے ہمارے علم اور تجربے میں اضافہ ہوتا ہے، اور مستقبل کی فکر کرنے سے ہی ہم میں محنت و مشقت کرنے کا پوزہ یا MOTIVATION جنم لیتا ہے جس کے بغیر انفرادی و اجتماعی زندگی کی گاڑی نہیں چل سکتی۔

لیکن ماضی کا غم اور مستقبل کا خوف دونوں ہی ایسے رجحانات ہیں کہ اگر یہ اپنی حد سے تجاوز کر جائیں تو ہمارے لئے مفید ہونے کے بجائے تکلیف دہ اور ضرر رساں بن جاتے ہیں۔ جب گزرے ہوئے واقعات پر غم و افسوس ضرورت سے زیادہ بڑھ جائیں اور آنے والے واقعات کا خوف و اندیشہ بہت شدت اختیار کر لے تو یہ دونوں حالتیں نفسیاتی امراض کی شکل اختیار کر لیتی ہیں اور انہیں ”DEPRESSION“ اور ”ANXIETY“ کہا جاتا ہے۔

کسی خاص وقت میں ہم پر سکون و پر امید ہوں گے یا مایوس و بے قرار، اس کا دار و مدار کچھ تو حالات پر ہوتا ہے، لیکن زیادہ ہمارے اپنے رویے اور احساس پر۔۔ کسی کا قول ہے کہ:

”LIFE IS 10% WHAT HAPPENS TO ME AND 90% HOW I REACT TO IT“

سوال یہ ہے کہ اکثر لوگ افسردگی اور پریشانی کا آسانی سے کیوں شکار ہو جاتے ہیں اور وہ صحیح رویہ کون سا ہے جسے اگر ہم اپنے فکر و عمل کا جزو بنالیں تو مشکلات کا سامنا اطمینان اور عزم و ہمت کے ساتھ کر سکیں گے؟

اس موضوع پر دنیا میں بہت کچھ لکھا گیا ہے اور نفسیات کے ماہروں، فلسفیوں اور پادریوں نے اپنے اپنے طور پر مشورے دیئے ہیں۔ مثال کے طور پر ایک مشہور اور مقبول مصنف

(DALE CARNEGIE) لکھتا ہے کہ ہمیں انگریزی زبان کی ان دو کہاوتوں کو پیش نظر رکھنا چاہئے:

"IT'S NOUSE CRYING OVER SPLIT MILK."

یعنی جو ہو چکا ہے اور جسے تبدیل نہیں کیا جاسکتا اس پر او ایلا مچانے کا کوئی فائدہ نہیں، لہذا اس

کی فکر نہ کرو۔ "DON'T CROSS A BRIDGE UNTIL YOU COME TO IT."

یعنی آج کے لئے آج کی فکر کافی ہے۔ جو مرحلہ ابھی دور ہے اس کے لئے تیاری ضرور کرو، لیکن اس کے بارے میں تشویش کو اپنے اوپر مسلط نہ ہونے دو۔

بلاشبہ ان کہاوتوں میں صدیوں کی دانش اور تجربے کا نچوڑ موجود ہے، لیکن اس قسم کی باتیں ہمیں مایوسی اور خوف سے نہیں بچا پاتیں، اس لئے کہ ان سے عقل و منطق ضرور قائل ہو جاتے ہیں، دل کا سکون نہیں ملتا۔

زیر نظر مضمون میں ہم دیکھیں گے کہ آیا قرآن و سنت میں ایک عام انسان کے تفکرات اور غموں کا کوئی مستقل اور عملی حل موجود ہے یا نہیں؟ اور اگر موجود ہے تو وہ علاج کیا ہے؟ اس کے علاوہ ضمنی طور پر یہ بھی سمجھیں گے کہ اسلام کائنات میں شرکی کیا توجیہ پیش کرتا ہے؟

انسان اور حیوان میں ایک نمایاں فرق

سب سے پہلے اس سوال پر غور کرنا چاہئے کہ مشکلات و مصائب کیوں آتے ہیں؟ بظاہر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ چیزیں فطری اور قدرتی حالات میں سے ہیں۔ لیکن غالباً ایسا نہیں ہے۔ اس لئے کہ انسان کے برعکس جانوروں، پرندوں، اور کیڑے مکوڑوں کی زندگی میں بہ حیثیت مجموعی مزے زیادہ ہیں اور تکلیفیں کم۔ نیز جانوروں کو عموماً جسمانی تکلیف ہی پہنچتی ہے (یا وہ بے چینی جو کسی جلت کی تسکین نہ ہونے سے محسوس ہو) مگر انسان کو یہی نہیں بلکہ ذہنی، جذباتی، اور روحانی اذیتیں بھی ہوتی ہیں۔ انسان واحد مخلوق ہے جسے نفسیاتی دکھ پہنچتا ہے، اس کی روح بے چین ہو جاتی ہے، جذبات مجروح ہوتے ہیں، عزت نفس کو ٹھیس پہنچ جاتی ہے، اس کے لئے یا ماضی عذاب بن جاتی ہے، اس پر افسردگی اور حزن و ملال طاری ہوتے ہیں، اس

کو احساسِ جرم ستاتا ہے، آنے والی مصیبتوں کا خوف سوار رہتا ہے۔ آمدنی، صحت، اور بال بچوں کی فکریں اسے تنگ کرتی ہیں۔ اور صرف اتنا ہی نہیں، ساری انسانیت کا درد بھی اس کو تڑپا دیتا ہے۔ ع

لوٹ جاتی ہے اور ہر کو بھی نظر کیا کیجئے! ظاہر ہے کہ کسی گائے یا بٹخ پر یہ سب کچھ نہیں گزرتا۔ چنانچہ ایک امریکی نقاد اپنا مشاہدہ بیان کرتا ہے:

"JOY, INTERRUPTED NOW AND AGAIN BY PAIN AND TERMINATED ULTIMATELY BY DEATH, SEEMS THE NORMAL COURSE OF LIFE IN NATURE. ANXIETY AND DISTRESS, INTERRUPTED OCCASSIONALLY BY PLEASURE, IS THE NORMAL COURSE OF MAN'S EXISTENCE."

یہ واقعہ ہے کہ انسان تمام دوسری مخلوقات کے مقابلے میں زیادہ دکھ اٹھاتا ہے اور زیادہ مشقت برداشت کرتا ہے۔ یہ ایسا قاعدہ کلیہ ہے جس میں کوئی استثناء نہیں، سوائے اس کے کہ بعض لوگوں کو جسمانی تکلیف زیادہ اٹھانی پڑتی ہے، جبکہ ذہین اور حساس افراد کے لئے ذہنی کرب زیادہ ہوتا ہے۔ بقول شاعر۔

ہماری جان پر دہرا عذاب ہے محسن

کہ دیکھنا ہی نہیں ہم کو سوچنا بھی ہے

لہذا یہ بات ناقابل تردید ہے کہ ہر انسان کی زندگی میں ناگوار اور اذیت بخش گھڑیاں زیادہ آتی ہیں جبکہ کیف و سرور اور اطمینان کے لمحے مختصر رہتے ہیں۔

فلسفے کے نظریات

کائنات میں "شر" یعنی "EVIL" کا مسئلہ ہمیشہ سے فلسفیوں کا موضوع بحث رہا ہے۔ چنانچہ طوفانوں، زلزلوں، قحط، سیلاب اور وبائی امراض کو قدرتی نوعیت کا شر کہا گیا۔ لڑائیوں،

فسادات، بیماریوں اور موت کے ساتھ دکھوں اور الجھنوں کو جسمانی و ذہنی نوعیت کا شر قرار دیا گیا۔ پھر اخلاقی شر میں ظلم، استحصال، جرائم، جھوٹ، بے ایمانی، دغا بازی اور فحاشی کو شامل کیا گیا۔ جن لوگوں نے اتنی بہت سی برائیوں پر غور کیا تو ان کی نگاہ ہمیں مرکوز ہو کر رہ گئی اور وہ قنوطی (PESSIMIST) کہلائے۔ انہوں نے فیصلہ کیا کہ زندگی رنج و آلام اور مایوسیوں ہی کا نام ہے۔ ناآسودہ امنگیں اور ناکام خواہشیں ہمیں دکھوں میں مبتلا رکھتی ہیں اور ان دکھوں سے نجات کی کوئی صورت نہیں۔

موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں؟

یہ حقیقت ہے کہ ایک عام آدمی کا رجحان بالعموم قنوطیت کی طرف ہو جاتا ہے کیونکہ اسے زندگی میں خوشی اور کامیابی کم اور انفرادی، سماجی اور سیاسی محرومیاں زیادہ نظر آتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس کا تعلق انسان کے احساس سے بھی ہے کہ وہ بری اور مایوس کن باتوں پر خوب توجہ دیتا ہے لیکن انسان کی اچھائیوں اور فطرت کی مہربانیوں کو نظر انداز کر دیتا ہے۔ چنانچہ بعض دوسرے فلسفی رجائیت (OPTIMISM) کی طرف گئے اور انہوں نے اپنی توجہ حیات و کائنات کے روشن پہلوؤں پر رکھی۔ اس نظریے کے مطابق دنیا بنیادی طور پر اچھی جگہ ہے اور انسان فطرتاً نیک ہے۔ جو برائیاں ہمیں نظر آتی ہیں وہ مستثنیات میں سے ہیں۔

لیکن یہ دونوں نظریات انتہا پسندانہ ہیں اور اب ایک تیسرا فلسفہ اصلاحیت (MELIORISM) کے نام سے پیش کیا گیا ہے۔ اس کی رو سے یہ دنیا نہ تو بہت بری ہے اور نہ ہی بہت اچھی، بلکہ یہ بتدریج بہتری کی طرف جا رہی ہے۔

عقوبت گاہ یا عشرت کدہ؟

بعض مذہبی تعلیمات میں بھی قنوطیت کی طرف میلان ملتا ہے۔ چنانچہ ترک دنیا کرنے والے راہبوں، جوگیوں اور بھکشوؤں نے دنیا کو دارالاعذاب سمجھا۔ کہا گیا کہ انسان کو سزا کے طور پر زمین میں اتارا گیا ہے اور یہ کہ نسل انسانی کا ہر فرد آدم و حوا کے گناہ کی وجہ سے ملامت زدہ اور گناہ گار پیدا ہوتا ہے۔ یا یہ سمجھا گیا کہ دنیا کی مصیبتیں گذشتہ جنم کی غلط کاریوں کی سزایں۔ یا یہ کہا گیا کہ انسانی غموں کا سبب خواہشات اور تمنائیں ہیں اور ازالہ شرکی تدبیر یہ ہے کہ ہر قسم کی آرزوؤں سے انسان اپنے آپ کو خالی کرے۔

پھر وہ لوگ ہیں جنہوں نے حیات دنیا کی بے ثباتی دیکھ کر طے کیا کہ اسے عیش و عشرت کا موقع سمجھنا چاہئے۔ انہوں نے کہا کہ موت کا وقت کسی کو معلوم نہیں اور زندگی یوں بھی مختصر ہے لہذا جو وقت بھی میسر ہو اس سے بھرپور حظ اٹھانا چاہئے۔ شاذ ہی کوئی ہو گا جو لذت پرستی (HEDONISM) کو بہ حیثیت فلسفہ مانتا ہو، تاہم موجودہ دور کی مادہ پرستی کا منطقی تقاضا یہی ہے کہ انسان اپنی زندگی کو صرف حصول لذت میں گزار دے۔ ظاہر ہے کہ اگر کوئی جزا و سزا نہیں ہے تو نفس کے تقاضوں کو کسی اخلاقی ضابطے کی حدود میں رکھنے سے کیا حاصل؟ اگر ہمارا کوئی روحانی تشخص نہیں تو حیوانی جبلتوں کی تسکین کے علاوہ زندگی کا کوئی اعلیٰ مقصد بھی نہیں ہو سکتا۔ اگر موت زندگی کا خاتمہ کر دیتی ہے تو ہمارے پاس لطف اٹھانے کے بہت کم مواقع ہیں، جنہیں ہرگز ضائع نہیں کرنا چاہئے۔ چنانچہ اکثر لوگوں کی جدوجہد کا واحد ہدف دولت اکٹھی کرنا ہی رہ گیا ہے اور اس دولت کا مقصد صرف یہ سمجھا جاتا ہے کہ تمام ممکنہ آسائشوں اور سہولتوں کو زیادہ سے زیادہ مدت تک باقی رکھا جائے۔

حیاتِ انسانی کا مقصد

جو لوگ اپنے ذاتی مفاد سے بلند ہو کر سوچنے میں کامیاب ہوئے ان کا تصور یہاں تک پہنچا کہ پوری نسل آدم کی تکلیفوں کو گھٹانے اور آسانیوں کو بڑھانے کی کوشش کرنا چاہئے۔ گویا اب اس سوال کی کوئی خاص علمی و نظری اہمیت بھی نہ رہی کہ انسانی مصائب کا سبب کیا ہے، اور تمام توجہ اس مسئلے کی طرف مرکوز ہو گئی کہ ان مصائب کو کسی طرح کم سے کم کیا جائے۔ یہ اگرچہ اخلاقی اعتبار سے نہایت مطلوب و مستحسن نصب العین ہے، لیکن اس امر کا ثبوت بھی ہے کہ ہماری نظریں حیاتِ دنیا کے صرف ظاہری پہلو پر جم کر رہ گئی ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ دنیوی زندگی کو بہتر سے بہتر بنانے کی کوشش ضرور کرنا چاہئے، تاہم اس سوال کو سلجھانا بھی تو لازمی ہے کہ کائنات میں انسان کی حیثیت کیا ہے؟ یہ خیال ہرگز قرین قیاس نہیں کہ پوری کائنات کی سب سے زیادہ ذہین اور ترقی یافتہ مخلوق کے وجود کا سرے سے کوئی مقصد ہی نہیں ہے۔ انسان واحد مخلوق ہے جو نیکی و بدی میں فطری طور پر تمیز کرتا ہے، پھر یہ کیا معنی ہے کہ برے آدمی عیش و آرام میں غرق نظر آتے ہیں اور نیک لوگوں کو ان کی نیکی مصیبتوں سے نہیں بچاتی؟ حیوانات صرف جینے کے لئے زندہ رہتے ہیں اور ان کی زندگی حقیقتاً

محصض ENJOY کرنے یعنی لطف اندوزی کی مہلت ہے۔ لیکن اگر ہمارا جینا بھی اسی نوعیت کا ہے تو ہمیں جانوروں سے ہزاروں گنا بہتر عقل و شعور کیوں حاصل ہے؟ اور اگر ہم محض ایک حیوان ہی ہیں تو فطرت کے غالب رجحان کے برعکس ہماری زندگی اتنی سخت اور مشکل کیوں ہے؟

خدا اور مسئلہ شر

یہ آخری سوال حل کرنے کی کوشش میں خدا کو ماننے والے بھی الجھن کا شکار ہو جاتے ہیں۔ کیا خدا کو اس بات سے کوئی خوشی ہوتی ہے کہ اس کے بندے دکھوں میں مبتلا رہیں؟ اگر وہ شفیق اور مہربان ہے تو کیا اتنا کمزور اور بے بس ہے کہ اپنی مخلوق کو مصائب سے بچانے نہیں سکتا؟ یہ بات عقل میں نہیں آتی کہ خدا مہربان ہو، ہر شے کا علم رکھتا ہو، ہر چیز پر قادر ہو اور پھر بھی انسانوں کی بڑی تعداد طرح طرح کی مصیبتوں کا شکار رہے؟

زندگی اپنی جب اس رنگ سے گزری غالب

ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

اور پھر کیسے ممکن ہے کہ خدا تو منع خیر ہو اور اس کی دنیا میں ہر طرف گناہوں کا دور دورہ رہے؟ چنانچہ مشہور انگریز فلسفی JOHN STUART MILL بالآخر اس نتیجے پر پہنچا کہ خدا یوں تو خیر کو پھیلانے کی کوشش کرتا ہے لیکن وہ اس کام کی پوری قدرت نہیں رکھتا کہ کائنات سے شر کو مٹا دے۔ BERTRAND RUSSELL نے اعتراض کیا ہے کہ اگر خدا قادر مطلق ہے تو اس کے حکم کی نافرمانی یا معصیت کیونکر ممکن ہوتی ہے؟

قرآن کی رہنمائی

دنیا میں انسان کو ہر طرح کے حالات سے سابقہ پیش آتا ہے اور کبھی تو بالکل "ROLLER COASTER" کی طرح اتار چڑھاؤ کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ان بدلتے ہوئے حالات میں اپنے ذہن کے توازن کو برقرار رکھنا، سازگار حالات دیکھ کر فخر و غرور کا شکار نہ ہونا اور مصائب میں ہمت اور امید کا دامن تھامے رہنا۔۔۔۔۔ بلاشبہ یہ آسان کام نہیں ہیں۔ لیکن قرآن حکیم سے انسانی زندگی کے مقصد، حیات دنیا کی حقیقت اور مصیبت و نعمت کی توجیہ کے ضمن

میں جو رہ نمائی ملتی ہے اس کی بدولت ہمیں دل کا مستقل سکون حاصل ہو سکتا ہے۔ نیز مسئلہ شر حاصل مل جاتا ہے۔ اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ افسردگی اور تشویش سے نجات ممکن ہے۔ اس سلسلے میں قرآن حکیم دس مختلف طریقوں سے ہمیں روشنی دکھاتا ہے۔ آپ چاہیں تو انہیں ”تعلیماتِ عشرہ“ کہہ لیں۔

پہلا سبق: یہ کائنات کسی کھلنڈرے کا کھیل نہیں، کسی اسٹیج کا ڈرامہ نہیں، بلکہ اسے ایک خاص مقصد اور ایک عظیم غایت کے ساتھ پیدا کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

”اور ہم نے آسمان و زمین کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہے کھیل تماشے کے طور پر نہیں بنایا۔“ (انبیاء: ۶۶)

”ہم نے آسمانوں اور زمین اور ان کے درمیان کی چیزوں کو ایک خاص مقصد کے تحت اور ایک معین مدت کے لئے پیدا کیا ہے۔“ (احقاف: ۳)

ہمیں کبھی یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ کا ہر فعل کسی نہ کسی حکمت و مصلحت کے تحت ہوتا ہے۔ جب ایک عام عقل رکھنے والا انسان بھی کسی وجہ کے بغیر کوئی کام نہیں کرتا، تو اللہ تعالیٰ کا ”جو“ ”الحکیم“ ہے، کوئی کام عبث یا بلا وجہ کیسے ہو سکتا ہے؟ لہذا یہ بات سمجھ لینا چاہئے کہ زندگی کے اچھے برے حالات نہ تو محض اتفاقات کا نتیجہ ہوتے ہیں اور نہ فقط مادی اسباب کی کار فرمائی، بلکہ ان کے پیچھے اللہ تعالیٰ کا ارادہ اور اس کی حکمت بالغہ چھپی ہوتی ہے۔ ظاہر ہے کہ جو ہستی اتنی عظیم کائنات کی خالق و مدبر ہے اس کے لئے معمولی بات ہے کہ ہماری نفسی سی دنیا میں کسی گناہ، کسی معصیت، کسی رنج اور کسی دکھ کو باقی نہ رہنے دے۔ یقیناً اللہ کو ہر شے پر پوری قدرت حاصل ہے۔ اگر یہاں شریبایا جاتا ہے تو صرف اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کی حکمت کا تقاضا یہی ہے۔

دوسرا سبق: انسان کی زندگی دراصل وہ مہلت ہے جو اللہ تعالیٰ نے اس کی آزمائش کے لئے عطا کی ہے۔ یہ امتحان ہوش سنبھالتے ہی شروع ہو جاتا ہے، اور جس کو ہم موت کہتے ہیں وہ محض امتحان کا وقت ختم ہو جانے کا اعلان ہے۔ لہذا یہ دنیا نہ تو دار العذاب ہے اور نہ عشرت کدہ، بلکہ فی الواقع یہ ایک دار الامتحان ہے۔ ارشاد الہی ہے:

”اللہ نے موت اور زندگی کو ایجاد کیا تاکہ تم لوگوں کو آزما کر دیکھے کہ تم میں سے کون

بہتر عمل کرنے والا ہے۔“ (ملک: ۲)

”ہم نے انسان کو ایک مخلوط نطفے سے پیدا کیا تاکہ اس کا امتحان لیں اور اس غرض کے لئے ہم نے اسے سننے اور دیکھنے والا بنایا۔“ (دھر: ۲)

ہمارا خالق یوں تو ہمارے جو اس ظاہری کی دسترس سے ماوراء ہے، لیکن اس نے ہمارے دلوں کے اندر اور کائنات میں ہر طرف اپنی بے شمار نشانیاں رکھ دی ہیں، جن پر غور کر کے ہم اسے پہچان سکتے ہیں۔ پھر وہ بار بار یاد دہانی کے لئے پیغمبروں کو بھی مبعوث کرتا رہا ہے۔ وہ دیکھنا چاہتا ہے کہ ہم میں سے کون لوگ فطرت، وجدان، اور عقل کے اشاروں کو سمجھ کر اور انبیاء کی دعوت کو قبول کر کے اس پر ایمان لاتے ہیں اور کون اس سے بغاوت کی روش اختیار کرتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ اگر پوری حیات دنیا ایک امتحان ہے تو اس امتحان کے نتائج کے لئے ایک اور زندگی ہونا چاہئے، جہاں فرمانبرداروں کو انعام ملے اور مجرموں کو سزا۔ قرآن حکیم اس دوسری زندگی کو، جو ہمیشہ باقی رہنے والی ہے، دار الآخرة کہتا ہے اور اصل اہمیت اسی کو دیتا ہے۔ جو شخص وہاں کامیاب ہو گیا اصل کامیابی اسی کی ہے خواہ وہ دنیا میں کتنا ہی مفلس اور خوار اور مصائب کا شکار رہا ہو۔ اسی طرح حقیقی ناکامی اس شخص کی ہے جو وہاں ناکام ہو گیا، خواہ دنیا میں اسے کتنی ہی دولت و شہرت اور آرام و آسائش حاصل رہی ہو۔

فلاح و خسران کا یہ معیار اگر سامنے رہے تو انسان دنیا کی بڑی سے بڑی مصیبت پر بھی دل شکستہ نہیں ہو سکتا اور قیمتی سے قیمتی نعمت پا کر بھی خوشی سے بے قابو نہیں ہوتا۔ اس لئے کہ اصل قدر و قیمت اس چیز کی نہیں جو یہاں ملتی ہے بلکہ اس کی ہے جو وہاں ملے گی۔ ارشاد الہی ہے:

”یہ مال اور اولاد محض دنیوی زندگی کی ایک ہنگامی آرائش ہے، اصل میں تو باقی رہ جانے والی نیکیاں ہی تیرے رب کے نزدیک نتیجے کے لحاظ سے بہتر ہیں اور انہی سے اچھی امیدیں بھی وابستہ کی جاسکتی ہیں۔“ (کہف: ۳۵، ۳۶)

(جاری ہے)

